18

الٰہی جماعتوں کے لیے مصائب اور ابتلاؤں کا آنا نہایت ضروری ہوتا ہے

(فرمودہ 24 جون 1949ء بمقام پارک ہاؤس کوئٹہ)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

''جہاں تک میں سمجھتا ہوں اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علوم اور اس کی دی ہوئی خبروں سے مجھے معلوم ہوتا ہے جماعت کے لیے اب ایک ہی وقت میں دو قسم کے زمانے آ رہے ہیں۔ اور الٰہی جماعتوں کے لیے ہمیشہ ہی یہ دونوں زمانے متوازی آیا کرتے ہیں۔ یعنی ایک ہی وقت میں ترقی اور ایک ہی وقت میں ابتلاؤں کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ وہ آخری زمانہ نہیں آ جاتا جس میں تمام تکالیف ختم ہو جاتی ہیں اور صرف ترقیات ہی ترقیات باقی رہ جاتی ہیں۔ لیکن الٰہی سنت سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب بیرونی مصائب کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے تو اُس وقت اندرونی مصائب شروع ہو جاتے ہیں۔ صحابہؓ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے عرب پر مسلمانوں کو فتح دے دی تو اس کے بعد وہ خاموش ہو کر نہیں بیٹھ گئے بلکہ صحابہؓ نے اپنے لیے ایک اَور مصیبت سہیڑ لی۔ یعنی ایک ہی وقت میں انہوں نے قیصر اور کسریٰ دو زبردست بادشاہوں سے جو اُس زمانہ میں سب سے زیادہ طاقت رکھتے تھے لڑائی شروع کر دی۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ شاید دنیا کی لالچ یا دنیا کی بڑائی کی خواہش

میں صحابہؓ نے ایسا کیا لیکن واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔ دنیا کی بڑائی اور دنیا میں ترقی کی خواہش کوئی نہ کوئی علامتیں اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ مثلاً جب دنیوی بڑائی کسی کو مل جاتی ہے تو اُس سے وہ ذاتی طور پر فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے، ناجائز دباؤ لوگوں پر ڈالتا ہے، ناجائز رُعب ڈالتا ہے، ناجائز حکومتیں کرتا ہے، ناجائز طور پر اموال پر قبضہ کر لیتا ہے، ناجائز طور پر جائدادیں بناتا ہے یا ان جائدادوں کو اپنے دوستوں میں تقسیم کرتا ہے۔ یہ علامتیں ہوتی ہیں جن سے پہچانا جا سکتا ہے کہ اس کے دل میں دنیا کی لالچ یا دنیا کی بڑائی کی خواہش موجود ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص دنیوی فتوحات کے بعد ان چیزوں کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا، نہ قوم کے اموال اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے نہ لوگوں پر ناجائز حکومت کرتا ہے، نہ اُن پر دبدبہ اور رُعب جتاتا ہے، نہ اپنی شان دکھانے کی کوئی کوشش کرتا ہے تو ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ دنیوی اغراض کے ماتحت اپنی بڑائی چاہتا تھا۔ صحابہؓ کو جو فتوحات حاصل ہوئیں اُن سے انہوں نے ذاتی طور پر کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ وغیرہ نے مفتوحہ علاقوں میں سے کچھ نہیں لیا، مفتوحہ جائدادوں میں سے کچھ نہیں لیا، مفتوحہ اموال میں سے کچھ نہیں لیا سوائے اِس کے کہ انہوں نے اپنی قلیل ترین ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تھوڑا سا مال لے لیا مگر وہ بھی اتنا قلیل کہ اُس زمانہ کے عام لوگوں سے بھی کم تھا۔ اِس بات کو دیکھتے ہوئے ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں اور ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں صحابہؓ کا کسی ملک پر حملہ کرنا ان لوگوں کی ذاتی خواہش کے ماتحت نہیں تھا۔

دوسری بات جو عام طور پر پیش کی جاتی ہے اور ایک حد تک صحیح بھی ہے وہ یہ ہے کہ دشمن نے حملے میں پہل کی اور وہ اپنے ملک کے دفاع کے لیے لڑنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ بات ایک حد تک درست ہے بلکہ بڑی حد تک درست ہے۔ قیصر نے بھی حملہ میں ابتدا کی اور کسریٰ نے بھی حملہ میں ابتدا کی اور مسلمان اُن کے مقابلہ کے لیے مجبور ہو گئے۔ مگر یہ دلیل اس بات کے ثابت کرنے کے لیے تو کافی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ ظالم نہیں تھے، یہ لوگ دشمن کو تباہ کرنے کی خواہش نہیں رکھتے تھے۔ دشمن نے حملہ کیا اور وہ اس کے دفاع کے لیے مجبور ہو گئے۔ مگر یہ دلیل اس سوال کے جواب کے لیے کافی نہیں کہ انہوں نے بعد میں بھی لڑائی کیوں جاری رکھی؟

لڑائی کرنے کا الزام تو اس سے دور ہو جاتا ہے مگر لڑائی جاری رکھنے کی ضرورت اس سے ثابت نہیں ہوتی۔ قرآن کریم نے یہ تو کہا ہے کہ تم ظالم کا ہاتھ روکو مگر قرآن کریم نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اگر تم صبر کرو اور دشمن کو معاف کر دینا بہتر سمجھو تو اسے معاف کر دو۔ اس نے یہ تو نہیں کہا کہ تھپڑ مارنے والے کے منہ پر تم ضرور تھپڑ مارو بلکہ اس نے یہ کہا ہے کہ اگر تم تھپڑ مارو تو تم مجرم نہیں ہو گے۔ اس نے یہ تو کہا ہے کہ تمہیں ظالم کے ظلم کا مقابلہ کرنے کی اجازت ہے مگر اس نے یہ نہیں کہا کہ ضرور مقابلہ کرو۔ یہ صرف ایک اجازت ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ اگر تم مقابلہ کرو گے تو ہم یہ نہیں سمجھیں گے کہ تم مجرم ہو بلکہ ہم یہ سمجھیں گے کہ تم نے ہماری اجازت سے ایک فائدہ اُٹھا لیا۔ اسلام یہ کہیں بھی حکم نہیں دیتا کہ ہر حالت میں دشمن کا مقابلہ کیا جائے اور اس سے لڑائی جاری رکھی جائے۔ چنانچہ یزید جب بادشاہ ہوا تو حضرت امام حسینؓ اُس سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن اَور کئی صحابہؓ جن میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی شامل تھے انہوں نے یزید کا مقابلہ نہیں کیا بلکہ چُپ کر کے اپنے گھروں میں بیٹھ گئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ یزید کو ظالم نہیں سمجھتے تھے۔ وہ یقیناً اُسے ظالم سمجھتے تھے۔ خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ جب معاویہؓ کی عمر بڑی ہوئی تو وہ ایک دفعہ مسجد نبوی میں آئے۔ یزید ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے لوگوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا خاندان ایسا ہے جس کی سرداری کو عرب لوگوں نے ہمیشہ قبول کیا ہے اور اسلام میں بھی ہمارے خاندان کو اللہ تعالیٰ نے بڑا رُتبہ دیا ہے۔ ہم نے اسلام کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں اور ہمیشہ اسلام کے دشمنوں کا مقابلہ کیا ہے لیکن اب میں ایسی عمر کو پہنچ چکا ہوں کہ میں سمجھتا ہوں شاید اب میں زیادہ دیر تک دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں آپ لوگوں کے سامنے یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ اگر آپ لوگ ناپسند نہ کریں تو میرے بعد یزید خلیفہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں اُس وقت اپنی ٹانگوں کے گرد پٹکا باندھے بیٹھا تھا۔ جب اُس نے یہ کہا تو میں نے اپنا پٹکا کھولا اور ارادہ کیا کہ کھڑے ہو کر معاویہ سے کہوں کہ اس بادشاہت کا یزید سے زیادہ وہ مستحق ہے جس کا باپ اُس وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش بدوش جنگ کر رہا تھا جب تیرا باپ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی کر رہا تھا اور اِس کا زیادہ مستحق وہ شخص ہے جو خود اُس وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر دشمن سے لڑائی کر رہا تھا جب تُو دشمن کی

صفوں میں شامل ہو کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کر رہا تھا۔ مگر پھر میں نے کہا اِس دنیوی بادشاہت میں کیا رکھا ہے۔1 (حضرت معاویہؓ کے زمانہ سے اسلامی خلافت کا سلسلہ نہیں رہا تھا بلکہ دنیوی بادشاہت مسلمانوں میں آ گئی تھی)۔ یہ ایک دنیا سے تعلق رکھنے والی چیز ہے اس کے لیے میں مسلمانوں میں تفرقہ اور انشقاق کیوں پیدا کروں؟ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ ارادہ بتاتا ہے کہ وہ یزید کی بادشاہت کو نادرست سمجھتے اور اسے لوگوں پر ایک ظلم قرار دیتے تھے۔ لیکن ان کا مقابلہ ترک کر دینا بتاتا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اسلام نے صرف مقابلہ کا ہی حکم نہیں دیا بلکہ بعض مصلحتوں کے ماتحت ظلم کو برداشت کرنے کی بھی ہدایت دی ہے۔ چنانچہ جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اجازت ہے کہ اگر تمہیں کوئی شخص تھپڑ مارے تو تم بھی اسے تھپڑ مارو وہاں اُس نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر تم مقابلہ کرنا مصلحت کے خلاف سمجھو تو تم چُپ رہو اور تھپڑ کا تھپڑ سے جواب مت دو۔ پس وہ دلیل جو عام طور پر ان جنگوں کے متعلق پیش کی جاتی ہے اس سے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ پر دشمن کے الزام کا دفاع تو ہو جاتا ہے، یہ تو پتا لگ جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ظلم نہیں کیا بلکہ قیصر نے ظلم کیا، حضرت عمرؓ نے ظلم نہیں کیا بلکہ کسریٰ نے ظلم کیا، حضرت عثمانؓ نے ظلم نہیں کیا بلکہ افغانستان اور بخارا کی سرحد پر رہنے والے قبائل اور کُردوں وغیرہ نے ظلم کیا لیکن اس امر کی دلیل نہیں ملتی کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو معاف کیوں نہ کر دیا؟ حضرت عمرؓ نے ان کو معاف کیوں نہ کر دیا؟ حضرت عثمانؓ نے ان کو معاف کیوں نہ کر دیا؟ جب وہ مقابلہ کے لیے نکلے تھے تو وہ قیصر سے کہہ سکتے تھے کہ تمہاری سپاہ سے فلاں غلطی ہوگئی ہے اگر اس کے متعلق تمہاری حکومت ہم سے معافی طلب کرے تو ہم معاف کر دیں گے اور اگر معافی طلب نہ کرے تو ہم لڑائی کریں گے۔ انہوں نے قیصر کے سامنے یہ پیش نہیں کیا کہ تم سے یا تمہاری فوج کے ایک حصہ سے فلاں موقع پر ظلم ہوا ہے اور چونکہ ہماری تعلیم یہ بھی ہے کہ دشمن کو معاف کر دو اس لیے اگر تم معافی مانگو تو ہم معاف کرنے کے لیے تیار ہیں بلکہ جب اس نے ظلم کیا وہ فوراً اس کے مقابلہ کے لیے کھڑے ہو گئے اور پھر اس مقابلہ کو جاری رکھا۔ جب کسریٰ کے سپاہیوں نے عراقی سرحد پر حملہ کیا تو سیاسی طور پر اس کے بعد صحابہؓ اور کسریٰ کے درمیان جنگ بالکل جائز ہوگئی لیکن اخلاقی طور پر حضرت عمرؓ کسریٰ کو یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ شاید تم نے اس حملے کا حکم نہ دیا ہو بلکہ سپاہیوں نے خود بخود حملہ کر دیا ہو اس

لیے ہم اس حملہ کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ تم ہم سے معافی مانگو اور اس فعل پر ندامت کا اظہار کرو مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانہ میں دشمنوں کو یہ نہیں کہا کہ تم نے ظلم تو کیا ہے لیکن چونکہ ہمارا مذہب ظلم کی معافی کی بھی تعلیم دیتا ہے اس لیے ہم تمہیں معاف کرتے ہیں بلکہ وہ فوراً اس ظلم کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑے ہوگئے اور لشکر بھیجے، لڑائی کی اور پھر اس لڑائی کو جاری رکھا۔ آخر اس کی کیا وجہ تھی؟ اگر ہم غور کریں تو ہمیں معلوم ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ سوائے اس کے اَور کوئی نہیں تھی کہ حضرت ابوبکرؓ جانتے تھے کہ جب بھی بیرونی خطرہ کم ہوا اندرونی فسادات شروع ہو جائیں گے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قیصر نے حملہ نہیں کیا بلکہ خدا نے حملہ کیا ہے تا مسلمان اس مصیبت کے ذریعہ اپنی اصلاح کی طرف توجہ کریں اور اپنے اندر نئی زندگی اور نیا تغیر پیدا کریں۔ حضرت عمرؓ جانتے تھے کہ کسریٰ نے حملہ نہیں کیا بلکہ خدا نے حملہ کیا ہے تا کہ مسلمان غافل، سُست ہو کر دنیا میں منہمک نہ ہو جائیں۔ بلکہ ہر وقت بیدار اور ہوشیار رہیں۔ حضرت عثمانؓ جانتے تھے کہ بعض قبائل نے مسلمانوں پر حملہ نہیں کیا بلکہ خدا نے حملہ کیا ہے تا کہ مسلمان بیدار ہوں اور ان کے اندر ایک نئی روح اور نئی زندگی پیدا ہو۔

غرض مصائب خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں اور اس لیے آتے ہیں تا کہ قومیں اپنی روحانیت کو قائم رکھ سکیں اور آرام کے سامانوں کے پیدا ہونے کی وجہ سے وہ کلّی طور پر دنیا کی طرف مائل نہ ہو جائیں۔ یہ مقام کہ انسان دنیا میں پڑنے کے باوجود دین کی روح کو قائم رکھے یہ ممکن ہے بلکہ اسے روحانی ترقی کی منزلِ مقصود قرار دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں "دست در کار دل بایار"۔ ہاتھ کام کے اندر ہونا چاہیے اور دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی محبت موجزن ہونی چاہیے۔ یہ مقصود ہے جو صوفیاء نے انسان کا قرار دیا ہے اور اصل مقام روحانی ترقی کا یہی ہوتا ہے مگر انفرادی طور پر تو اس مقام کو حاصل کرنے والے کئی لوگ پائے جاتے ہیں لیکن قومی طور پر اس پر پہنچنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں آج تک کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں ملتی جو اِس مقام پر پہنچی ہو۔ افراد ملیں گے اور لاکھوں کروڑوں ملیں گے بلکہ اس زمانہ میں بھی جب مسلمان بادشاہتیں ظلم کر رہی تھیں، لُوٹ مار کر رہی تھیں اور اپنے غلبہ اور کامیابی کے نشہ میں چُور ہو کر اسی طرح لوگوں پر ظالمانہ حملے کر رہی تھیں جس طرح وحشی قبائل حملے کرتے ہیں مسلمانوں میں ایسے افراد موجود تھے

جو دنیا میں رہتے ہوئے اور تمام دنیوی کاموں میں حصہ لیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے اور اپنی روحانیت کو زندہ رکھتے تھے۔ انہوں نے عیسائیوں کی طرح دنیا چھوڑ نہیں دی بلکہ دنیا میں ہی رہے۔ وہ شادیاں بھی کرتے تھے، وہ بچے بھی پیدا کرتے تھے، وہ جائدادیں بھی بناتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی وہ اللہ تعالیٰ سے بھی کامل تعلق رکھتے تھے۔ لیکن یہ مثالیں صرف افراد میں پائی جاتی ہیں قوموں میں نہیں۔ فرد ہمیشہ ایسے نظر آتے رہیں گے جو بڑی سے بڑی دولتوں کے مالک ہو کر بھی اللہ تعالیٰ کو نہیں بھولتے۔

حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ جب فوت ہوئے تو اڑھائی کروڑ روپیہ اِن کے گھر سے نکلا۔ اس زمانہ کے لحاظ سے اڑھائی کروڑ کے معنے کم سے کم اڑھائی ارب روپیہ کے ہیں۔ اِس زمانہ میں روپیہ کی قیمت بہت گر گئی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم اس زمانہ کے روپیہ کی قیمت کا صحیح اندازہ لگائیں تو اڑھائی کروڑ کے معنے دس ارب روپیہ کے ہیں۔ لیکن اگر کم سے کم سَو گُنا فرق رکھا جائے تو اڑھائی ارب روپیہ بنتا ہے۔ اِس زمانہ میں ہی جنگ سے پہلے روپیہ کی جو قیمت تھی آج اُس سے چار گُنا کم ہے یعنی ایک روپیہ آج صرف چَوَنی کا ہے اور تیرہ سَو سال کے زمانہ کو مدنظر رکھتے ہوئے تو یہ فرق کم از کم سَو گُنا ہو جاتا ہے۔ پس اڑھائی کروڑ کے معنے آجکل کے لحاظ سے اڑھائی ارب کے ہیں اور اِس زمانہ میں بھی اڑھائی ارب روپیہ رکھنے والے ساری دنیا میں صرف دس پندرہ آدمی ہوں گے اور وہ بھی امریکہ، فرانس اور جرمنی میں۔ پس یہ استثنائی دولت ہے جو شاذ و نادر کے طور پر بعض لوگوں کو حاصل ہوتی ہے مگر اتنی دولت رکھنے کے باوجود تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور وہ اپنا اکثر مال مسلمانوں کی ترقی کے لیے خرچ کر دیا کرتے تھے۔

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا گو خود نہیں کماتی تھیں مگر صحابہؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی وجہ سے آپ کی خدمت میں اکثر ہدایا[2] پیش کرتے رہتے تھے۔ لیکن ان کی زندگی بھی دنیاداروں والی زندگی نہیں تھی بلکہ وہ اپنا اکثر روپیہ غرباء اور مساکین میں تقسیم کر دیا کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ ان کے بھانجے نے جس نے اُن کے مال کا وارث ہونا تھا ایک دفعہ یہ دیکھتے ہوئے کہہ دیا کہ حضرت عائشہؓ تو اپنا سارا مال لُٹا دیتی ہیں۔ یہ خبر جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو پہنچی تو آپ

نے اپنے گھر میں اُس کا آنا جانا بند کر دیا اور قسم کھائی کہ اگر میں نے اسے اپنے گھر میں آنے کی اجازت دی تو میں اس کا کفارہ ادا کروں گی۔ کچھ عرصہ کے بعد صحابہؓ نے آپس میں صلح کرا دی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھانجے کو معاف کر دیا۔ مگر کہا کہ چونکہ میں نے عہد کیا تھا کہ اگر میں اس سے کلام کروں گی تو کفارہ ادا کروں گی اس لیے میں اس کا کفارہ یہ قرار دیتی ہوں کہ آئندہ میرے پاس جو دولت بھی آئے گی میں غرباء میں تقسیم کر دیا کروں گی۔3 اگر روپیہ کمانا یا روپیہ کا کسی شخص کے پاس موجود ہونا منع ہوتا تو کیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ کہہ سکتی تھیں کہ میرے پاس جتنا روپیہ بھی آیا یا جتنی بھی دولت آئی وہ میں سب کی سب غرباء میں تقسیم کر دیا کروں گی؟ کیا تم نے کبھی ایسا کیا ہے کہ تمہیں کوئی دوست شراب تحفۃً دے تو تم اسے قبول کرلو اور پھر اپنے کسی اَور دوست یا غریب کو دے دو؟ یا کیا تم ایسا کر سکتے ہو کہ تم سؤر کا گوشت قبول کرلو؟ روپیہ قبول کرنے کے معنے یہ ہیں کہ ہمارے لیے روپیہ لینا جائز ہے۔ اور کسی دوسرے کو واپس کرنے کے یہ معنے ہیں کہ ہم نے ایک جائز چیز لینے کے بعد اُس کے خرچ کا ایک اَور محل سوچ لیا ہے۔ پس حضرت عائشہؓ کے ہدایا قبول کرنے کے معنے ہی یہ تھے کہ وہ اس کو جائز سمجھتی تھیں۔ مگر پھر دوسروں کو دے دینے کے یہ معنے تھے کہ میں اپنے سے زیادہ فلاں فلاں افراد کو مستحق سمجھتی ہوں۔ اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان ہدایا کو ردّ فرما دیتیں تو چونکہ عام لوگ اُس معیار پر نہیں پہنچے ہوئے تھے جس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پہنچی ہوئی تھیں اس لیے وہ اس وہم میں مبتلا ہو جاتے کہ حضرت عائشہؓ نے ہماری قدر نہیں کی۔ ہم بڑی محبت سے ان کے لیے کپڑا لائے تھے یا پھل لائے تھے یا روپیہ لائے تھے اور انہوں نے قبول نہیں کیا۔ شاید ہم سے کوئی قصور ہو گیا ہو۔ اور پھر وہ بار بار کہتے کہ ہمیں بھی بتایا جائے کہ ہم سے کیا خطا ہوئی ہے اور ہماری غلطی کو معاف کیا جائے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرتے تب بھی بہرحال اُن لوگوں کو روپیہ نہ دیتے جن کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دینا چاہتی تھیں۔ اِس وجہ سے حضرت عائشہؓ نے خیال فرمایا کہ مجھے ان سے جھگڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ان سے روپیہ لے لیتی ہوں یا جو کچھ یہ نذرانہ پیش کرنے آئے ہیں وہ لے لیتی ہوں بعد میں میں غرباء کو دے دوں گی۔ اِس طرح دونوں باتیں ہو جاتیں۔ صحابہؓ کا دل بھی خوش ہو جاتا اور غرباء کی بھی امداد ہو جاتی۔

اِسی قسم کا طریق بعض اَور اولیاء بھی اپنی زندگی میں اختیار کرتے رہے ہیں۔ میں نے تو کسی کتاب میں یہ واقعہ نہیں پڑھا لیکن حضرت خلیفہ اول سنایا کرتے تھے کہ ایک بزرگ بڑے آسودہ حال تھے اور وہ اپنے مال سے غرباء کا حق ہمیشہ نکالتے رہتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی یہ بھی عادت تھی کہ وہ روزانہ بازار میں چلے جاتے اور لوگوں سے بھیک مانگنی شروع کر دیتے اور شام کو بھیک مانگ کر جو کچھ جمع کیا ہوتا وہ غریبوں میں تقسیم کر دیتے۔ ایک دفعہ اُن سے کسی دوست نے کہا کہ آپ نے یہ کیا ذلّت کا طریق اختیار کیا ہوا ہے؟ آپ اپنے روپیہ میں سے بیشک غریبوں کو دیجیے لیکن بھیک مانگنا، دکانوں پر لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانا اور سارا دن سائل بن کر لوگوں کے پیچھے پیچھے پِھرتے رہنا یہ بہت ہی معیوب بات ہے۔ انہوں نے کہا تم میرے فعل کی حکمت نہیں سمجھے۔ جو روپیہ خدا تعالیٰ مجھے دیتا ہے اور پھر میں آگے تقسیم کر دیتا ہوں اس کا ثواب بیشک مجھے ملے گا۔ اور اگر خدا تعالیٰ کا کوئی عذاب نازل ہونے والا ہوا تو میرا یہ فعل اس کے عذاب سے مجھے بچا لے گا۔ لیکن چونکہ یہ لوگ جو میرے اردگرد رہتے ہیں اپنے مالوں میں سے خدا کا حق نہیں نکالتے اس لیے اگر ان پر عذاب نازل ہوا تو ہمسایہ ہونے کی وجہ سے ممکن ہے میں بھی اس میں شریک ہو جاؤں۔ اس لیے میں خود ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔ یہ میرا لحاظ کر کے کچھ دے دیتے ہیں اور میں آگے دے دیتا ہوں۔

غرض افراد میں تو ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ بڑے بڑے مالدار ہونے کے باوجود وہ خدا تعالیٰ کو نہیں بھولے بلکہ اس کی محبت میں ترقی کرتے چلے گئے اور اخلاص اور روحانیت میں بڑھتے گئے لیکن قوموں میں ایسی مثالیں نہیں ملتیں۔ قوم بحیثیت قوم جب تک مصیبت میں گِھری رہتی ہے وہ روحانی منازل بڑی سُرعت سے طے کرتی رہتی ہے۔ لیکن جب مصائب میں سے نکل جاتی ہے تو اُس کا قدم رُک جاتا ہے اور وہ تنزل میں گِرنی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں افراد میں چونکہ کامل اور غیر کامل دونوں وجود ہوتے ہیں کامل وجود ان حالات میں بھی اپنے مقام پر قائم رہتے ہیں لیکن غیر کامل گِر جاتے ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کی بجائے دنیا کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ جانتے تھے کہ اگر میں نے جنگیں نہ کیں تو مسلمانوں کے اخلاق گر جائیں گے۔ حضرت عمرؓ جانتے تھے کہ اگر میں نے جنگیں نہ کیں تو مسلمانوں کے اخلاق گر جائیں گے۔

حضرت عثمانؓ جانتے تھے کہ اگر میں نے جنگیں نہ کیں تو مسلمانوں کے اخلاق گر جائیں گے اس لیے انہوں نے لڑائیوں کو جاری رکھا اور مصائب کا سلسلہ قومی طور پر مسلمانوں پر جاری رہا۔ حضرت علیؓ اور معاویہؓ کے زمانہ میں مسلمانوں کے باہمی اختلاف کو دیکھ کر قیصر نے پھر دوبارہ حملہ کرنا چاہا مگر چونکہ اُس وقت سُستی اور تنزل کا زمانہ شروع ہو چکا تھا مسلمانوں نے اس کا مقابلہ نہیں کیا۔ اگر اُس وقت حضرت معاویہؓ قیصر کے مقابلہ کے لیے نکل کھڑے ہوتے جیسا کہ انہوں نے دھمکی بھی دی تھی کہ اگر تم نے حملہ کیا تو سب سے پہلا جرنیل جو علیؓ کی طرف سے تمہارے مقابلہ میں نکلے گا وہ میں ہوں گا4 یا اگر قیصر اس دھمکی کے باوجود حملہ کر دیتا اور حضرت معاویہؓ جنگ کے لیے نکل کھڑے ہوتے تو حضرت علیؓ اور معاویہؓ کی باہمی جنگیں بالکل ختم ہو جاتیں لیکن معاویہؓ کا دماغ وہ نہیں تھا جو حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا دماغ تھا۔ انہوں نے صرف پیغام دینا کافی سمجھا حالانکہ جب دشمن نے حملے کا ارادہ کر لیا تھا تو یہ لڑائی کے لیے ایک کافی وجہ تھی۔ اگر معاویہؓ بھی قیصر کے مقابلہ کے لیے نکل کھڑے ہوتے اور حضرت علیؓ بھی اُس کے مقابلہ کے لیے اپنا لشکر بھجوا دیتے تو پھر دوبارہ تمام مسلمانوں میں جوش پیدا ہو جاتا، ان کے اندر ایک نئی بیداری پیدا ہو جاتی اور وہ منافقت جو آرام کے زمانہ کی وجہ سے اُن میں پیدا ہو چکی تھی بالکل جاتی رہتی۔

تو مصائب کا زمانہ روحانی ترقی کے لیے ایک نہایت ضروری چیز ہے۔ اگر کسی وقت باہر سے مصائب نہ آئیں تو مومن کو چاہیے کہ وہ اپنے لیے اندرونی طور پر مصائب تلاش کرنے کی کوشش کرے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا امتحان ضرور لیتا ہے مگر جب بندہ خود اپنے آپ کو امتحانات میں ڈالے رکھے تو اللہ تعالیٰ کسی اَور امتحان میں اسے نہیں ڈالتا۔ آپ فرمایا کرتے تھے سردی میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا یا گرمیوں میں روزے رکھنا یہ بھی ایک ابتلا ہے اور انسان ان کاموں میں حصہ لینے سے تکلیف محسوس کرتا ہے لیکن جب کوئی انسان خوشی سے اپنے اوپر مختلف ابتلاء وارد کر لے، گرمیوں میں روزے رکھنے پڑیں تو وہ روزے رکھنے کے لیے تیار ہو جائے، سردیوں میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا پڑے تو وضو کرنے کے لیے تیار ہو جائے، حج کرنے کا موقع نکل آئے تو گھر بار اور وطن چھوڑ کر حج کے لیے چلا جائے، زکوٰۃ دینے کا وقت آئے تو اپنے مال کا مقررہ حصہ فوراً غرباء کے لیے نکال دے تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے

کہ میں نے اس کا امتحان تو لینا تھا مگر اب میں امتحان لے کر کیا کروں یہ تو اپنے آپ کو خود ہی امتحان میں ڈالے ہوئے ہے۔لیکن جب وہ ان باتوں میں سُستی کرتا ہے اور اپنے آپ کو ابتلاؤں میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے مختلف امتحانات میں ڈالا جاتا ہے۔ اس وقت اگر تو اُس کے اندر صرف عملی سُستی پائی جاتی ہو تو خدائی امتحان کے بعد اُس میں بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔اور اگر اس کا ابتلاؤں سے بچنا اندرونی بگاڑ کی وجہ سے ہو اور ایمان کی خرابی اس کا باعث ہو تو ابتلاء آنے پر وہ تباہ ہو جاتا ہے۔غرض قوموں کے لیے خصوصاً انبیاء کی جماعتوں کے لیے ابتلاؤں کا آنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔

یہ غلط خیال ہے کہ ابتلا صرف ابتدائی زمانہ میں آتے ہیں ترقی کے زمانہ میں ابتلاؤں کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔انبیاء کی جماعتوں کی ترقی اور ابتلا یہ دو توام بھائی ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ابتدائی سے ابتدائی زمانہ میں بھی ابتلا آتے ہیں اور ترقی کے انتہائی زمانہ میں بھی ابتلا آتے ہیں۔ابتدا سے انتہا تک ابتلاؤں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔جب نبی ایک منفرد وجود ہوتا ہے اور اُس پر صرف ایک یا دو آدمی ایمان لانے والے ہوتے ہیں اُس وقت بھی ابتلا آتے ہیں اور انتہائی عروج کے وقت بھی جب سلسلہ کو ترقی پر ترقی حاصل ہو رہی ہوتی ہے اُس وقت بھی ابتلا آتے ہیں۔محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے دن بھی مصائب اور مشکلات میں سے گزرنا پڑا اور آپؐ کو اور آپؐ پر ایمان لانے والوں کو مختلف قسم کے ابتلا پیش آئے۔اور اس کے بعد جب ترقیات کا زمانہ آیا اُس وقت بھی ان ابتلاؤں کا سلسلہ جاری رہا۔یہ نہیں ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں کسی دن اِس خیال کے ساتھ سوئے ہوں کہ اب تمام مشکلات پر قابو پا لیا گیا ہے اور وہ تمام مسائل جو مسلمانوں کی ترقی کے ساتھ تعلق رکھتے تھے حل ہو چکے ہیں۔نہ حضرت ابوبکرؓ نے کبھی ایسا خیال کیا، نہ حضرت عمرؓ نے کبھی ایسا خیال کیا، نہ حضرت عثمانؓ نے کبھی ایسا خیال کیا اور نہ ہماری جماعت کو کبھی ایسا خیال کرنا چاہیے۔یہ چیزیں الٰہی سلسلوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اور ان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کے ابتلاؤں کو برداشت کریں۔اور اگر ابتلا نہ آئیں تو خود ان کو تلاش کرنے اور اپنے اوپر وارد کرنے کی کوشش کریں۔جیسے حضرت ابوبکرؓ نے قیصر پر حملہ کر دیا حالانکہ صلح کا راستہ بھی ان کے لیے کُھلا تھا۔اسی طرح حضرت عمرؓ نے کیا کہ باوجود اس کے کہ کسریٰ کے

ساتھ وہ صلح کر سکتے تھے انہوں نے صلح نہیں کی بلکہ کسریٰ کے ساتھ لڑائی کی اور پھر یہ لڑائی جاری رکھی۔ اِسی طرح اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے ہم پر ابتلا وارد نہ ہوں تو ہمیں خود اپنے لیے ابتلا تلاش کرنے چاہییں تا کہ جماعت کے اندر بیداری پیدا ہو اور وہ اپنے آپ کو بڑھانے اور ترقی دینے کی کوشش کرے۔ ابھی تو ہماری وہی مثال ہے کہ ''گے آمدی وگے پیر شدی''۔ ہمارا دنیا میں آنا اور کسی قدر تغیر پیدا کرنا بے شک ہماری نگاہ میں ایک بڑی چیز ہے لیکن دنیا کے لیے یہ کوئی بڑی چیز نہیں۔

عربی میں ایک مثل مشہور ہے کسی بیل کے سَر پر ایک مچھر جا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد کہنے لگا بھائی بیل! تم بھی حیوان ہو اور میں بھی حیوان ہوں، مجھے بھی لوگ مارتے ہیں اور تم کو بھی مارتے ہیں اس لحاظ سے تمہیں میری ہمدردی کرنی چاہیے اور مجھے تمہاری ہمدردی کرنی چاہیے۔ میں اِس وقت اُڑتے اُڑتے تھک کر تمہارے سر پر تھوڑی دیر کے لیے آ کر بیٹھ گیا ہوں۔ اگر تمہیں میرے بیٹھنے سے بوجھ معلوم ہوتا ہو تو مجھے بتا دو تا کہ میں اُڑ جاؤں اور تمہیں تکلیف نہ ہو۔ بیل نے جواب دیا کہ بھائی مچھر! مجھے تو یہ بھی پتا نہیں لگا کہ تم کب میرے سر پر آ کر بیٹھے ہو۔ مجھے تمہارا بوجھ کیا محسوس ہونا ہے۔ یہی حال ہمارا ہے۔ ہم بھی اپنی تنظیم اور اپنی قربانیوں اور اپنے منصبوں کے کام کی وجہ سے یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے دنیا میں بہت بڑا کام کر لیا ہے لیکن دنیا اِس کو کوئی کام نہیں سمجھتی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس خیال کے پیدا ہونے میں ہمارے کام کا اتنا دخل نہیں ہوتا جتنا اللہ تعالیٰ کے الہامات اور اس کی پیشگوئیوں کا دخل ہوتا ہے۔ ہم جب ایک طرف اللہ تعالیٰ کے الہامات کو دیکھتے ہیں اور دوسری طرف جماعت کی تنظیم اور اس کی قربانیوں اور اپنے مبلغین کے کام پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم نے دنیا میں عظیم الشان کام کر لیا ہے حالانکہ وہ عظیم الشان مقام جس کے حصول کے بعد دنیا کسی جماعت کی اہمیت کا انکار نہیں کر سکتی ابھی ہمیں حاصل نہیں ہوا۔ اور ابھی وہ زمانہ ہم پر نہیں آیا جس میں ہماری جماعت کی عظمت اور اس کے وجود کو بَرمَلا تسلیم کیا جائے۔ اور اُس زمانہ کے لانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر ایسی طاقت اور قوت پیدا کریں کہ نہ صرف ہم ہر قسم کے ابتلاؤں کو برداشت کریں بلکہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتلا وارد نہ ہو تو ہم خود اُس سے اپنے لیے ابتلا مانگیں۔ ابتلا کی برداشت ہر شخص کر سکتا ہے۔ اس کے لیے کسی بڑی قربانی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ابتلاؤں کا مانگنا اصل چیز ہوتی ہے مگر مانگنے سے مراد

جاہلانہ مانگنا نہیں۔ ایک مانگنا مصلحت کے مطابق ہوتا ہے اور ایک مانگنا مصلحت کے خلاف ہوتا ہے۔
ایک بزرگ کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے کسی سے پوچھا کہ توکّل کے کیا معنی ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ توکّل کے معنے یہ ہیں کہ جب خدا تعالیٰ دے تو انسان کھا لے اور جب نہ دے تو صبر کرے۔ وہ نادان صوفی تھا اور توکّل کے صحیح معنے نہیں جانتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ توکّل تو کُتّے میں بھی پایا جاتا ہے۔ کُتّے کو بھی مل جاتا ہے تو کھا لیتا ہے اور اگر نہیں ملتا تو صبر کرتا ہے۔ انسان کا مقام تو پہلے ہی جانور سے بڑا ہے۔ پھر ان معنوں کے لحاظ سے اس میں اور کُتّے میں کیا فرق ہوا؟ انسان تو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ روحانیت حاصل کرے اور اللہ تعالیٰ کے قُرب میں ترقی کرے۔ پھر اس کے لیے توکّل کے وہ معنے کس طرح ہو سکتے ہیں جن میں ایک کُتّا بھی شریک ہے۔ وہ حیران رہ گیا اور اس کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ ابتلاؤں کے آنے پر ان کو برداشت کرنا کوئی اعلیٰ مقام نہیں بلکہ اس میں کافر اور بے دین لوگ بھی شریک ہیں۔ ایک کافر کا بچہ بھی مر جاتا ہے تو بسا اوقات بڑے حوصلہ سے وہ اس صدمہ کو برداشت کرتا ہے۔
پہلی جنگِ عظیم میں ہی ایک جرمن عورت جو 80 سالہ بڑھیا تھی اور جس کے سات بچے تھے اُس نے اپنے ساتوں بچے میدانِ جنگ میں بھیج دیئے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی مشیّت کے ماتحت یکے بعد دیگرے اس کے بچے مرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اس کا صرف ایک بچہ رہ گیا۔ آخر فرانس کے ایک شدید حملہ میں اُس کا ساتواں بچہ بھی مارا گیا۔ قیصر یُوں تو بہت ظالم تھا مگر نفسیات کا بہت بڑا ماہر تھا اور وہ اپنی قوم سے حقیقی محبت رکھتا تھا جس طرح ہٹلر اپنی قوم سے حقیقی محبت رکھتا تھا۔ یہ دونوں لیڈر ظالم بھی تھے مگر اپنی قوم کے سچے عاشق بھی تھے۔ چونکہ یہ رپورٹ نہایت اہم تھی کہ ایک عورت نے سات بچے دیئے اور وہ ساتوں کے ساتوں جنگ میں مارے گئے اس لیے جب یہ خبر پہنچی کہ اس عورت کا ساتواں بیٹا بھی مارا گیا ہے تو جرنیل نے اس خبر کو وزیرِ جنگ کے پاس بھیجا اور وزیرِ جنگ نے اس خبر کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اسے بادشاہ کے پاس بھجوا دیا۔ بادشاہ نے حکم لکھا کہ جس طرح عام طور پر رشتہ داروں کو مرنے والوں کی اطلاع دی جاتی ہے اس طرح اس عورت کو اطلاع نہ بھجوائی جائے بلکہ خود وزیرِ جنگ اس عورت کو اپنے سامنے بُلائے اور میری طرف سے اُس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہے کہ قیصر اور جرمن قوم دونوں اس ماں کا

شکریہ ادا کرتے ہیں جس نے اپنے ساتوں بیٹے ملک کے لیے تباہ کر دیئے ہیں۔ چنانچہ اس بُڑھیا کو شاہی پیغام پہنچا۔ وہ وزیرِ جنگ کے پاس آئی۔ وزیرِ جنگ نے اس کا استقبال کیا اور کہا مجھے قیصر کی طرف سے حکم ملا ہے کہ میں قیصر کی طرف سے اور جرمن قوم کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کروں کیونکہ آپ نے اپنے ساتوں بچے ملک کے لیے پیش کر دیئے تھے جن میں سے چھ تو پہلے مر چکے ہیں اور اب کل ہی تار کے ذریعے ہمیں خبر ملی ہے کہ آپ کا ساتواں بیٹا بھی جنگ میں مارا گیا ہے۔ ایک انگریزی جاسوس جو اِس موقع پر موجود تھا میں نے خود اُس کے ایک مضمون میں یہ واقعہ پڑھا ہے وہ کہتا ہے کہ یہ عجیب خبر سن کر اخبارات کے نمائندے وہاں جمع ہو گئے تھے جن میں مَیں بھی شامل تھا۔ لڑائی کے ایام میں جاسوسی کرنے والے کسی دوسری قوم میں شامل ہو جاتے ہیں اور اِس طرح خفیہ طور پر حالات معلوم کرتے رہتے ہیں۔ وہ اُس وقت ڈچ یا کسی اَور قوم کے نمائندہ کے طور پر اندر آیا حالانکہ انگریزی جاسوس تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ بُڑھیا اس خبر کو سُن کر باہر نکلی تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ اِس خبر نے اُس کی کمر کو بالکل توڑ دیا ہے لیکن وہ جذبہ حُبُّ الوطنی ظاہر کرنے کے لیے اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر اور زور سے دبا کر اُسے سیدھا کرنے کی کوشش کرتی تا کہ یہ ظاہر نہ ہو کہ اِس غم نے اُس کی کمر کو خمیدہ کر دیا ہے اور پھر زور سے قہقہہ لگا کر کہتی کیا ہوا اگر میرے ساتوں بیٹے مارے گئے ہیں۔ آخر وہ اپنے ملک کی خاطر قربان ہوئے ہیں۔ یہ ایک عیسائی عورت تھی۔ ایک ظالم قوم کا فرد تھی اُس کے ساتوں بچے مارے گئے تھے اور پھر وہ 80 سال کی عمر کو پہنچ چکی تھی مگر پھر بھی اس نے صبر کیا۔

پس مصائب اور آفات پر صبر کرنا ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں جو مسلمان کا خاصہ ہو۔ بلکہ صبر سے اوپر ایک اَور مقام ہے جو مومن کو حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ صرف صبر ہی نہیں کرتا بلکہ مصائب طلب کرتا ہے۔ دنیا کوشش کرتی ہے کہ ابتلاؤں سے بھاگے مگر وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو ابتلاؤں میں ڈالے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

در کوئے تُو اگر سرِ عشّاق را زنند　　　اوّل کسے کہ لافِ تعشق زند منم5

اگر تیرے کوچہ میں جانے والوں کے متعلق یہ حکم ہو جائے کہ ہر شخص جو عاشقی کا دعویٰ

کرے گا اُسے قتل کر دیا جائے گا تو گو عشق کا دل کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اور کوئی شخص دعویٰ کرے یا نہ کرے عاشق عاشق ہی ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ اعلان ہو جائے کہ جو بھی عشق کا دعویٰ کرے گا اُس کا سر قلم کر دیا جائے گا تو سب سے پہلا شخص جو عشق کا دعویٰ کرے گا اور کہے گا کہ میں عاشق ہوں وہ میں ہوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ عاشق اور مسلمان دو متضاد چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی چیز کے یہ دو نام ہیں۔ مگر عاشق سے میری مراد ہَوَس پرست عاشق نہیں بلکہ ایک سچا اور کامل مسلمان مراد ہے۔ پس ایک سچا عاشق اور مسلمان مصائب کو صرف برداشت ہی نہیں کرتا بلکہ مصائب طلب کرتا ہے۔ مصائب سے بھاگنا منافق کا کام ہے۔ مصائب کو برداشت کرنا صرف مسلمان کا خاصہ نہیں بلکہ ایک کافر بھی اس میں شریک ہوسکتا ہے۔ لیکن مسلمان وہ ہے جو نہ صرف مصائب کو برداشت کرتا ہے بلکہ مصائب طلب کرتا رہتا ہے۔ اگر کچھ دن اُس پر مصیبتیں نہیں آتیں تو وہ سمجھتا ہے کہ شاید میرا ربّ مجھ سے خفا ہو گیا ہے کہ اب وہ میرے ایمان کو دنیا پر ظاہر کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کر رہا۔

پس جماعت کو اپنے اندر یہ بات پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ قربانیاں اور ابتلا ہی ایک ایسی چیز ہیں جن سے اسلام کی ترقی وابستہ ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم اسلام کی ترقی کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ پس ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی جماعت کے ہر فرد کے اندر جذبۂ قربانی و ایثار پیدا کریں۔ ہم اپنی جماعت کے ہر فرد کے اندر مصائب کو برداشت کرنے کا مادہ پیدا کریں۔ ہم اپنی جماعت کے ہر فرد کے اندر طلبِ قربانی اور طلبِ ابتلا کا جذبہ پیدا کریں کیونکہ اِسی کے ذریعہ اسلام اور احمدیت نے ترقی کرنی ہے۔ اگر ضرورت کے مطابق ہمارے اندر قربانی کی روح نہیں ہوگی تو گو ہوگا وہی جو خدا نے کہا ہے مگر جو شخص ان قربانیوں میں حصہ نہیں لے گا وہ اور اُس کا خاندان اُن نعمتوں سے محروم رہ جائے گا جو اِس دور کے ساتھ مخصوص ہیں"۔

(الفضل 13 جولائی 1960ء)

---

1 : طبقات ابن سعد جلد 4 صفحہ 182 مطبوعہ بیروت 1985ء

2 : ہدایا: ہدیہ کی جمع۔ تحائف (اردو لغت تاریخی اصول پر جلد 21 صفحہ 705 کراچی 2007ء)

3 : بخاری کتاب المناقب مناقب قریش

4 : اَلْبداية و النهاية جلد 8 صفحہ 126 مطبوعہ بیروت 2001ء
5 : درثمین فارسی صفحہ 143۔ مطبوعہ نظارت اشاعت۔ ربوہ